مولانا محمد عیسیٰ منصوری*

دعوت الی اللہ کا فریضہ اور ہمارے دینی ادارے (۲)

دعوت میں کوتاہی کے ناقابلِ تلافی نقصانات: قرون اولیٰ کے بعد من حیث الامت دعوت میں کوتاہی سے جو نقصانات ہوئے، ان کی تلافی کبھی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً برطانیہ کے بادشاہ جان لاک لینڈ (۱۱۶۷ء--۱۲۱۶ء) جس نے مشہور میگنا کارٹا (منشور آزادی) دیا، جب اس کے پادریوں سے اختلافات بڑھے تو اس نے ۱۲۱۳ء میں مراکش واسپین کے حکمران ناصرلدین اللہ کے پاس سفارت بھیجی جس کے ارکان میں ٹامس ہارڈینٹن، رالف فرنکسوس، ماسٹر رابرٹ وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے شاہِ انگلستان کی طرف سے پیغام دیا کہ عیسائیت پر سے میرا اعتقاد ختم ہو گیا ہے، اگر آپ پادریوں کے مقابلے پر میری فوجی مدد کریں تو میں اپنی پوری رعایا کے ساتھ مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔ سفیروں نے مزید کہا کہ ہم انگلستان کے باشندے لاطینی، انگریزی، فرانسیسی زبانوں کے علاوہ مختلف صلاحیتوں کے ساتھ یورپ میں اسلام پھیلائیں گے، مگر شاہِ مراکش ناصرلدین اللہ نے پیش کش ٹھکرادی۔ ناصرلدین اللہ کو یہ ٹھکرانا بہت مہنگا پڑا۔ نتیجتاً ناصرلدین اللہ کی زندگی ہی میں اس کے چھ لاکھ کے لشکر جرّار کو فرانس، انگلینڈ، اسپین کی افواج نے شکست فاش دے کر اسپین کا بڑا حصہ چھین لیا۔ اس طرح ایک عظیم امکان بدترین انجام میں بدل گیا۔ حالیہ دنوں میں مشہور اخبار ٹائمز نے لکھا تھا کہ تیرہویں صدی کے ابتدا میں امکان پیدا ہو گیا تھا کہ انگلستان خالص مسلم ملک بن جاتا اور برطانیہ میں قرآن کا حکم نافذ ہوتا۔

اسی طرح شہنشاہِ روس ولادیمیر اول (۹۵۶ء-۱۰۱۵ء) کا اعتقاد بت پرستی سے اٹھ گیا تو اس نے مسلمان علما کو بلایا اور اسلام کی فطری تعلیمات سے دلچسپی ظاہر کی، لیکن کہا کہ میں شراب کا عادی ہوں، اسے چھوڑنا مشکل ہے۔ اس مسئلے میں مجھے رخصت دی جائے، باقی سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ علما رخصت دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے بعد عیسائی علما نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے رخصت دے دی تو اس نے عیسائیت سے اصولی طور پر مطمئن نہ ہونے کے باوجود مسیحیت قبول کر کے پوری مملکت کو بتوں خالی کروا کر اپنی ساری رعایا کو عیسائی بنا دیا۔ ان علما کو اسلام کا مسئلہ معلوم تھا، لیکن وہ شاید دعوت کی اس حکمت سے ناواقف تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثقیف طائف کو زکوٰۃ و جہاد وغیرہ سے وقتی رخصت عطا فرما کر اختیار کی تھی اور فرمایا تھا کہ جب اسلام قبول کرلیں گے تو زکوٰۃ بھی دیں گے،

*چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم، برطانیہ

جہاد بھی کریں گے۔اسی طرح ۱۸۹۱ء میں جاپان کے شہنشاہ میجی نے خلافت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبدالحمید ثانی کو لکھا کہ ہم اتحادی ہیں، ہماری مصلحت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے قریب ہوں تا کہ ہمارے درمیان معنوی رشتہ قائم ہو جائے اور فرمائش کی کہ اسلام کو ان کے ملک میں بطور تحفہ بھیجا جائے جیسے کسی دور میں بدھ مذہب بطور تحفہ بھیجا گیا تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے ترکی کے شیخ الاسلام اور بڑے علما کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔علما کسی بات پر متفق نہ ہو سکے، باہم مختلف ہو گئے۔ بالآخر سلطان نے شکریہ کا خط لکھا اور کہا کہ ہم بعد میں کبھی (اسلام) کے مبلغین بھیجنے کی کوشش کریں گے۔آج جاپان صنعت وٹیکنالوجی کا بے تاج بادشاہ ہے، دنیا کا سب سے بڑا معطی (اقوام عالم کو امداد دینے والا) اور اقوام متحدہ کا سب سے زیادہ خرچ اٹھانے والا ملک اور دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی طاقت ہے۔ان ساری ترقیوں کے باوجود واضح مقصد حیات یا قابل برآمد نظریہ نہیں رکھتا۔ جاپانی وزارت خارجہ کے ایک قابل افسر ہڈیا کی کا سے (HIDEAKKASE) نے کہا ہمارے پاس کچھ آدرش (نظریات) ہونے چاہییں جس میں عالم انسانی کے لیے اپیل ہو۔اگر ہم دعوت کے ان تینوں مواقع میں سے کسی ایک سے بھی فائدہ اٹھالیتے تو شاید آج دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی۔ یہ عظیم نقصان دعوت کے مزاج وذہنیت کھو دینے کا نتیجہ ہے۔

<u>قرون اولیٰ کے بعد ملت اسلامیہ نے دعوت کو فریضہ سمجھنا چھوڑ دیا:</u> قرون اولیٰ کے بعد عام مسلمان تو درکنار، عام طور پر علماء کرام نے دعوت سے اغماض برتا، ہندوستان کے آٹھ سو سالہ مسلم دور میں علماء کرام یا تو شاہی درباروں سے منسلک ہو کر اپنی دنیوی ضروریات پوری کرنے میں لگے رہے یا اپنے حجروں میں بیٹھ کر درسی کتب پر شروحات وحواشی چڑھاتے رہے یا انہوں نے خود کو مسلمانوں کی ضروریات دین نماز، روزہ، اور فضائل ومسائل بتانے تک محدود رکھا، دعوت واشاعت اسلام پر بہت کم توجہ دی گئی، اگر دور غلامی (برٹش دور) میں بھی ہمیں ہوش آجاتا اور ہم آنے والے دور کا اندازہ کر کے اپنی صلاحیت، طاقت اور وسائل برصغیر کے اقوام کو اللہ کا پیغام پہنچانے میں لگائے ہوتے تو آج برصغیر کا نقشہ مختلف ہوتا، نہ ملت اسلامیہ ہند تین ٹکڑوں میں بٹتی نہ ایک تہائی سے زیادہ حصہ بدترین دشمن برہمن کے یہاں یرغمال بنتا، تقریباً ہم نے پونے دوسو سال تک ملک کی آزادی کی جو جنگیں لڑیں ان میں کیسی کیسی صلاحیت وصفات والے ہزاروں اکابر علماء ومشائخ نے جام شہادت نوش کیا، پھانسی پر چڑھے قید وبند اور ہر طرح کے مصائب سے گزرے اس سارے جہاد کا رزلٹ یہ ہے کہ وہ برہمن جس کی کبھی کوئی حیثیت نہیں تھی آج عالمی صہیونیت وصلیبیت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پوری دنیا سے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے پر کمربستہ ہے ہماری پوری چودہ سو سالہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے دعوت کے سوا جہاں کہیں ہمارا جان ومال، وسائل وصلاحیتیں صرف ہوئیں اس کا نتیجہ ہمارے حق میں ہر اعتبار سے تباہ کن ثابت ہوا۔

<u>برصغیر میں مسلم اقتدار کے بعد کی صورت حال:</u> برصغیر سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد زوال وتباہی دن بدن بڑھتی گئی حتیٰ کہ اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ برصغیر میں اسپین کی تاریخ نہ دہرادی جائے ان نازک حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور آپ کے چاروں نامور صاحبزادگان اور سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی ہمہ جہت کاوشوں کی بدولت ملت اسلامیہ ہند میں قرآن وسنت کی تعلیم اور دعوت وجہاد کی روح زندہ ہوئی

شروع ہوئی، پھر حضرت گنگوہیؒ حضرت نانوتویؒ حضرت شیخ الہندؒ اور ان اکابر سے وابستہ حضرات کی کوششوں نے حالات کو کچھ اور سمبھالا دیا، جگہ جگہ تعلیم وتعلم اور ذکر وفکر کے چراغ روشن ہونے لگے، پھر بیسویں صدی میں شیخ حسن البناؒ، مولانا الیاسؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا مودودیؒ کی دعوتی سرگرمیوں کی بدولت ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل، مغربی تہذیب وتمدن مغربی فلسفہ میں پوری طرح ضم ہوکر ختم ہونے سے بچ گئی، بلا شبہ ان میں سے بعض حضرات نے فکری طور پر ٹھوکریں بھی کھائی، غرض جب کبھی ملت اسلامیہ پر نازک حالات آئے، تو دعوت ہی سے حالات اسلام کے حق میں پلٹے ایک ایک داعی (شیخ حسن البنا، مولانا الیاس، مولانا ابوالحسن ندویؒ مولانا مودودیؒ) کی بدولت سیکڑوں ہزاروں ادارے وجود میں آئے، دوسری طرف تعلیمی ودینی اداروں کے لاکھوں کروڑوں پڑھنے والوں میں سے عموماً اللہ تعالیٰ نے صرف انہی لوگوں سے کام لیا جو کسی داعی یا دین کا درد کڑھن رکھنے والی صاحب نسبت شخصیت سے وابستہ ہوئے۔

مذہب انسان کی فطری ضرورت ہے: مذہب ہر انسان کی فطری ضرورت ہے جس طرح ایک بچہ ایرپورٹ یا اسٹیشن پر اپنی ماں سے بچھڑ جائے آپ اسے کھلونے چاکلیٹ ٹافی سب کچھ دیدیں لیکن جب تک اسے ماں نہ ملے گی وہ روتا تڑپتا رہے گا، اسی طرح انسان اپنے خالق سے بچھڑ کر کبھی چین وتسکین نہیں پاسکتا، اسے سکون قلب سے جینے کے لیے ضرورت ہے، ایک اطمینان بخش نظریۂ حیات (آئڈیالوجی) کی ضرورت انسانی فطرت ہے، وہ کوئی ایسی آئڈیالوجی چاہتا ہے جس کے ذریعہ کائنات کی اور اپنی زندگی کی توجیہ کر سکے، مقصد حیات کو پاسکے، خود کو تسکین دے سکے۔

موجودہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ نظریاتی خلا ہے: رشیا کی آئڈیالوجی (کمیونزم) وقتی اور فرضی تسکین تھی جو جھوٹی اور غلط ثابت ہوچکی ہے، اور اس کے بعد سرمایہ دارانہ نظام دنیا کے معاشی بحران میں دوسری آئڈیالوجی یعنی کیپٹل ازم کا نظریہ بھی منہدم ہو چکا، اب دنیا میں زبردست نظریاتی خلا پیدا ہوگیا۔ ۱۹۹۱ء میں سویت یونین کا انہدام اور ۹؍جنوری ۱۹۹۲ء میں امریکی صدر جورج بش کا ٹوکیو (جاپان) میں ڈنر کے وقت کرسی سے گر پڑنے کے وقت اس دن کے ٹائمس آف انڈیا نے (BUSH COLLAPSES AT TOKYO RECEPTION) کی سرخی لگائی۔

گویا نئی صدی (اکیسویں صدی) شروع ہونے سے پہلے روس کے حقیقی اور امریکہ کے علامتی انہدام نے دنیا میں نظریاتی خلاء کا اعلان کر دیا تھا، اس کو صرف اور صرف اسلام ہی پُر کرسکتا ہے، کیونکہ علوم کے ارتقا اور جدید سائنس نے اسلام کی حقانیت کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے، مراکش کے مشہور کرسچن اسکالر ڈاکٹر مورس بوکائی نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''بائبل قرآن، اور سائنس'' میں قرآن اور بائبل کے سینکڑوں سائنسی بیانات کو جدید سائنسی اور علمی تحقیقات کی کسوٹی پر پرکھ کر ثابت کیا ہے کہ جدید سائنس اور علمی تحقیقات کی رو سے قرآن کے سینکڑوں سائنسی بیانات میں ایک بات بھی غلط ثابت نہ ہوسکی، اس کے برخلاف بائبل، ہر سائنسی بیان، جدید علمی تحقیق اور سائنس نے غلط ثابت کر کے رد کر دیا۔ یہ اس مذہب (کرسچن یا عیسائیت) کی بات ہے جو اسلام سے صرف ۵۷۰ سال پہلے کا ہے۔ یہودیت، بدھ ازم اور ہندومت جو عیسائیت سے ہزاروں سال قبل کے ہیں، جدید سائنسی وعلمی دور میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکے۔ یہ مذہب قرآن کے الفاظ میں اساطیر الاولین یعنی پچھلی من گھڑت کہانیوں کا پلندہ ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک باشعور شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی کتاب نہیں بلکہ اپنی فطرت پڑھ رہا ہے۔ اسے قرآن فطرت کی آواز یا

پکار محسوس ہوتی ہے، اس لیے اس کا انکار نہ صرف اپنی فطرت یعنی خود اپنی نفی کرنا ہے۔ کون ہے جو خود اپنی نفی کا متحمل ہو سکے! جدید علوم کی روشنی میں آج اسلام ہر شخص کے لیے ایسا ہی قابل قبول ہے جیسے پیاسے کے لیے پانی۔

ہر کچے پکے گھر میں اسلام کے داخلے کی پیشین گوئی کا وقت آ پہنچا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشین گوئی ہے: لایبقی علی ظھر الارض بیت مدرٍ ولا وبرٍ الا ادخل الله کلمة الاسلام (مشکوٰۃ شریف) روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر ایسا نہیں بچے گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک جدید ترین الیکٹرونک میڈیا کے باوجود کمیونسٹ بلاک (عظیم سویت یونین) میں اسلام کا پیغام پہونچنا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا، مگر سوویت امپائر کے انہدام کے بعد لگتا ہے وہاں کی سرزمین اسلام کی کہیں زیادہ پیاسی ہے، چنانچہ برطانیہ کے اخبار ڈیلی ٹائمز نے ۱۲/ مارچ ۱۹۹۰ء کو روس کے بارے میں ایک بالتصویر رپورٹ چھاپی تھی جس کا نہایت بامعنی عنوان رکھا۔ (Karl Marx Makes Room for Mohammad) کارل مارکس، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جگہ خالی کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آج کا انسان سیاسی مذہب کے بجائے روحانی مذہب کا متلاشی ہے جس سے سکونِ قلب میسر آئے۔ عصر حاضر کی نئی نسل، خواہ وہ عیسائی، بدھسٹ، ہندو ہو، خوب جانتی ہے کہ چرچ اور مندروں کے اسٹیچو (مورتیاں) خدا نہیں ہیں۔ خدا وہ ہے جو نہ گرے نہ ٹوٹے۔ دنیا میں بے شمار افراد اذان کے الفاظ کا ترجمہ معلوم کر کے یا نماز پڑھنے کا عملی منظر دکھ کر یا قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ پڑھ کر مسلمان ہو رہے ہیں۔ یورپ کے مشہور ادیب واسکالر جارج برنارڈ شا نے بہت پہلے پیشین گوئی کر دی تھی کہ اسلام عقل اور فطرت انسانی کے عین مطابق واحد قائم شدہ مذہب ہے اس کی تعلیمات سے کوئی ذہین تعلیم یافتہ شخص انکار نہیں کر سکتا، جدید تعلیم یافتہ ذہن کے لیے اسلام قبول کرنے میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں کہ اگر وہ اسلام کو لیتا ہے تو عقل وسائنس کو چھوڑنا پڑے۔ جارج برنارڈ شا نے تقریباً ایک صدی پہلے کہہ دیا تھا کہ جلد اسلام عظیم سیلاب بن کر تیزی کے ساتھ یورپ کی انسانی آبادیوں میں داخل ہوگا اور مغرب کے لیے مستقل کا مذہب اسلام ہی ہوگا۔ اسی طرح افریقہ میں عیسائی مشنریوں کی کوششیں پوری طرح پھیل چکی ہیں، لیکن وہاں اسلام تیزی سے اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ ابھی چند سال پہلے عالمی عیسائی مشنریوں نے ایک چھوٹے سے پس ماندہ افریقی ملک لیبریا (LIBERYA) کی راجدھانی منورویا (MONROVIYA) میں ایک عالمی مشنری نے وہاں کے دس لاکھ مسلمانوں کو کرسچن بنانے کے لیے پانچ ہزار افراد کو اس قدر تیار کیا کہ وہ وہاں کی نصف درجن قبائلی زبانیں بھی روانی سے بولتے تھے۔ انہیں خاموشی سے مسلم قبائل کے درمیان بسا دیا گیا۔ وہاں کے علما نے سمجھداری سے کام لیا، انہیں مذاہب کانفرنسوں اور علمی مباحثوں کے ذریعہ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پانچ ہزار عیسائیت کے داعی ومبلغین مسلمان ہو کر اسلام کے مبلغ بن گئے۔

جدید علمی وسائنسی دور کا مذہب: قرآن انسانیت کے نام خالق کائنات کا آخری پیغام ہے جس طرح خالق ہر اعتبار سے مخلوق پر حاوی اور غالب ہے اسی طرح اس کا کلام اور پیغام بھی، البتہ ہر ہر دور کے انسانوں کی ذہنی سطح اور علوم وفنون کے مطابق اس کے معجزات ظاہر ہوتے رہیں گے جب فصاحت وبلاغت الفاظ کے دقائق سمجھنے کا دور تھا

قرآن کے کلام کی فصاحت وبلاغت اور الفاظ کی تاثیر کا معجزہ ظاہر ہوا، بائبل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ قوموں کو تسخیر کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ایک تلوار نکلتی ہے (یوحنا عارف کا مکاشفہ ۱۵/۹۰۰) یعنی تاثیر والا کلام جس کی تاثیر نے آپ کی حیات مبارکہ ہی میں جزیرۃ العرب کو تہ وبالا کر دیا تھا، موجودہ دور طبعیات وسائنس کے علوم سے انفس وآفاق کی ہر ہر چیز کے متعلق تفصیلی کھوج وتحقیق کا دور ہے تو دنیا حیران ہے کہ جو نئی تحقیق اور ریسرچ سامنے آتی ہے وہ قرآن میں موجود پاتی ہے۔

<u>دعوت، آخری دور کا سب سے مؤثر اسلحہ</u>: پتھر کے دور سے لے کر آج الیکٹرونک اسلحہ کے دور تک ہر دور میں اسلحہ کی نوعیت بدلتی رہی۔ آنے والے دور کا اسلحہ دعوت اور میڈیا ہے۔ ماضی قریب میں رشیا کو شکست امریکی اسلحہ نے نہیں بلکہ امریکی میڈیا نے دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا غلبہ اور فتوحات اسی راہ سے ہوگی۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی کہ قیامت کے قریب ایک شہر جس کا ایک رخ خشکی کی طرف ہوگا اور دوسرا سمندر کی طرف، دونوں طرف کی شہر پناہ (دیواریں) مسلمان لشکر کے لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر کے نعرے سے گر جائیں گی۔ اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آخری دور کا سب سے بڑا اسلحہ دعوت ہوگی اور یہ دعوت مسلمانوں کے عالمی غلبہ وکامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر آخری دور میں اسلحہ کے بغیر اسلام کی فکری ونظریاتی اور دعوتی طاقت قوموں کو مسخر کرنے والی ہوگی۔

<u>مغرب میں دعوت کے خلاف عالمی طاقتوں کا خفیہ منصوبہ</u>: موجودہ دور میں قدرت کے مخفی ہاتھ نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو مغرب (امریکہ یورپ) میں پہنچا دیا ہے۔ شاید ان سے کوئی کام لینا منظور ہے۔ ایسے دور میں جب انسانی مسائل کے حل میں سارے نظریات ومذاہب ناکام ہو چکے ہیں اور عصر حاضر کے انسان کو اپنی روح کی پیاس بجھانے کے لیے ایک نظریۂ حیات کی اشد ضرورت ہے، شاید فطرت کی یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ اللہ کا انتظام ہے۔ ہم نے یہاں (مغرب) پہونچ کر سینکڑوں ہزاروں مساجد ومکاتب اور درجنوں دار العلوم قائم کیے، مگر ایسا چھوٹا سا سینٹر نہیں بنا سکے جہاں نو مسلموں کو سال دو سال رکھ کر انہیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کروا کر ان کے اپنے معاشرے میں داعی بنا کر بھیجیں۔ ہماری اس غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ تیس چالیس سالوں میں مغرب میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے، خواہ وہ اپنی ذاتی جستجو سے مسلمان ہوئے ہوں خواہ کسی نے مسلمان کیا، آج وہ سب کے سب شیخ ناظم ترکی کے پاس پہونچ چکے ہیں جس کا کام تصوف کا نام لے کر امت میں تفرقہ پیدا کرنا اور ان نو مسلموں کو معطل بنانا ہے تاکہ وہ دعوت کا کام نہ کر سکیں۔ اس شخص (شیخ ناظم) کے نزدیک امام حرم، عرب علما، علمائے دیوبند، تبلیغی جماعت، سلفی حضرات سبھی باطل وگمراہ ہیں (غالی قبر پرست بدعتیوں کے سوا)۔ بندہ کی تحقیق کے مطابق یہ شخص عالمی صہیونی طاقتوں کا گماشتہ ہے، اس کا آقا وشیخ مراکش میں صیہونیوں کا ایجنٹ ہے اور اس شخص کو امریکی ایما پر عرب حکمران کروڑوں اربوں روپے دے رہے ہیں۔

<u>دینی جامعات اور عصری تقاضے</u>: آج ہماری سب سے بڑی ضرورت اقوام عالم کے لیے داعی تیار کرنا ہے، اس کام کے لیے نظر بار بار ہمارے دینی اداروں (دار العلوم اور جامعات) کی طرف جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں

کہبر صغیراور جنوبی ایشیا کے مما لک میں ان دینی مدارس کا نہایت اہم رول رہا ہے۔آج ان مما لک میں جو دین اور علم دین کے چرچے ہیں،سب انہی کی برکتیں ہیں۔ یہ بلاشبہ دین کے قلعے ہیں،لیکن وقت کے علوم وضروریات کے ساتھ ساتھ ان دینی قلعوں میں بھی آج کی عصری ضرورتوں کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے۔آج مضبوط و مستحکم قلعے بھی آثار قدیمہ کے میوزیم بن کر رہ گئے ہیں۔اسی طرح ہمارے دینی مدارس میں تقویٰ وتوکل کی صفات اور عصری تقاضوں کا شعور نہ رہے تو اندیشہ ہے کہ یہ بھی آثار قدیمہ بن کر نہ رہ جائیں۔گذشتہ دنوں بندہ کا یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک میں جانا ہوا جس کی آبادی چند لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ وہاں کی کرسچن مشنری میں دیکھا کہ وہاں بنگالیوں سے اچھی بنگالی، پنجابیوں سے اچھی پنجابی اور ہم سے اچھی اردو عربی بولنے والے موجود ہیں جبکہ عیسائیت ایک غیر دعوتی مذہب ہے۔ بائبل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ مشہور ہے کہ میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے بھیجا گیا ہوں، جبکہ اسلام ایک دعوتی دین ہے۔گذشتہ ڈیڑھ صدی میں ہمارے جامعات نے کتنے ایسے داعی تیار کیے جو اسپینش ، جرمنی،فرانسیسی یا رشین زبانوں میں دعوت دے سکیں۔گذشتہ ڈیڑھ صدی میں برصغیر میں دین کا بنیادی کام انہی دینی مدارس نے انجام دیا۔ان اداروں سے کما حقہ فائدہ اسی وقت تک ہوا جب تک وہ اصل بنیاد تقویٰ وتوکل پر قائم رہے۔ یاد رکھئے! ہماری بنیاد تقویٰ وتوکل،اور کفر کی بنیاد ملک ومال ہے اور بنیاد مثل زمین کے ہوتی ہے۔اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی زمین پر اپنی عمارت تعمیر کر لے تو صاحب زمین جب چاہے کہہ سکتا ہے اپنی عمارت اٹھا کر لے جاؤ، میری زمین خالی کرو۔تقویٰ وتوکل کے بجائے مال کی بنیاد پر بننے والے عظیم الشان جامعات گویا دوسروں کی زمین پر کھڑے ہیں۔ ایسے ادارے باطل کی ایک آندھی کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے، جیسے وسط ایشیا کے مما لک میں ہوا۔ سمرقند، بخارا، تاشقند وغیرہ میں سینکڑوں عظیم الشان دینی جامعات تھے۔کمیونزم کی ایک آندھی چلی اور سب جامعات زمیں بوس ہوگئے ۔روحانی صفات،تقویٰ وتوکل سے عاری فارغ ہونے والے مولوی صاحبان کی فوج ظفر موج باطل کے ایک جھونکے کی تاب نہیں لاسکے گی۔ وسط ایشیا میں علما اور عوام کا جوڑ ختم ہوگیا تو وہ عوام جو علما کے ہاتھ چومتے تھے، خود انہوں نے ان علما کی گردنیں کاٹیں۔

<u>افرادسازی میں ہمارے دینی جامعات ومدارس کی ناکامی</u>: تقریباً ایک صدی پہلے مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا تھا کہ ہمارے مدارس اور خانقاہ بانجھ ہوتے جارہے ہیں۔غور کریں تو ہمارے زکوٰۃ وصدقات کا بڑا حصہ دینی مدارس اور دارالعلوموں پر خرچ ہورہا ہے،مگر ان سے زیادہ تر معمولی صلاحیت کے لوگ مل رہے ہیں، رسمی امام وخطیب یا مکتبی مولوی۔ان بیچاروں کی اکثریت عربی تو درکنار، صحیح اردو لکھنے پڑھنے سے بھی عاری ہے۔ پھر یہ حضرات جو لکھتے بولتے ہیں، درسی زبان میں ہوتا ہے جو عام لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ برطانیہ میں پہلے ہم سوچتے تھے یہاں کوئی بڑا دارالعلوم ہونا چاہیے تاکہ یہاں کے ضروریات وتقاضوں کو پورا کرنے کے لیے افراد کار میسر آسکیں۔اب درجنوں دارالعلوم قائم ہوگئے،لیکن ہماری ضرورتیں جوں کی توں ہیں۔اگر ان جامعات کا حاصل مکتب میں پڑھنے والے مولوی صاحبان اور مساجد کے امام ہی ہے تو مکتبی مولوی اور مسجد میں نماز پڑھانے والے امام ان دارالعلوموں سے پہلے بھی میسر تھے۔

دعوت کا جذبہ اور فکرِ آخرت پیدا کرنے کی ضرورت: اگر کوئی شخص طالب علم بن کر ہمارے پاس آتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی نسبت اور ارادہ دین کے کام کرنے کا ہو کہ مجھے اب زندگی میں صرف دین کا کام کرنا ہے، اور اہلِ مدارس کو بھی چاہیے کہ جن طلبہ کے بارے میں اندازہ ہو کہ ان میں نہ دین پھیلانے کا جذبہ ہے نہ دین پر چلنے کا شوق تو انہیں ضروریاتِ دین کا علم دے کر دو سال میں فارغ کریں۔ ملت کا پیسہ ان پر ضائع نہ کریں۔ موٹی سی بات ہے، اگر کسی شخص کو محض اپنی ذاتی قابلیت پیدا کرنے یا اپنے معاش کے لیے علم و ہنر سیکھنا ہے تو اسے اپنے ذاتی اخراجات سے سیکھنا چاہیے، جیسے دنیا میں ہر شخص کار چلانا، کمپیوٹر کا استعمال، ہندی انگریزی زبان اپنے اخراجات سے سیکھتا ہے۔ ملت کی زکوٰۃ و صدقات کی امانت ایسوں پر پر کیوں ضائع کی جائے؟ ہمارے دینی مدارس کے اخراجات کا خاصا بڑا حصہ ایسے لوگوں پر ضائع ہو رہا ہے جو دین پھیلانے کا جذبہ نہیں رکھتے۔ دعوتی اسپرٹ کے بغیر طالب علم کو علم دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کاغذوں میں علم جمع کر دے یا آڈیو، ویڈیو کیسٹ میں بھر دے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام دعوت کے ذریعہ انسانوں کے دلوں کا رخ دنیا سے آخرت کی طرف اور خواہشات سے رضائے الٰہی کی طرف موڑ دیتے تھے، پھر انسان کی ساری زندگی آخرت بنانے کی فکر اور رضائے الٰہی کی طلب میں گزرتی تھی۔ ہم مدارس کے ذریعہ کسی درجہ میں علوم تو دے رہے ہیں، مگر ان کے دلوں میں فکرِ آخرت اور اللہ کا تعلق پیدا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ جب دلوں میں دنیا بسی ہو تو انسان کی ساری علمی صلاحیتیں بھی اپنی دنیا بنانے پر صرف ہوتی ہیں۔ ادھر چند سالوں میں ہمارے دینی و تعلیمی جامعات میں تخصص کے شعبہ جات قائم کرنے کا ذوق اور رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ بہت اچھی چیز ہے کہ زمانہ کسی فن میں تخصص ہی کا ہے۔ ہر علم و فن ایک وسیع سمندر ہے۔ انسان کسی ایک شعبۂ علم میں بھی بصیرت و رسوخ پیدا کر لے تو بڑی بات ہے، مگر یہاں بھی اصل خرابی یہی ہے کہ صلاحیت پیدا کرنے کے ساتھ دلوں کا رخ آخرت کی طرف کرنے پر توجہ نہیں۔ اگر ہم بنظرِ غائر دیکھیں کہ گذشتہ پچیس تیس برسوں میں دیوبند سے کیرالہ تک جن طلبہ نے دینی علوم و فنون میں تخصص کیا، مثلاً قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، ادب، معاشیات، انگریزی زبان، عربی زبان، کمپیوٹر کا استعمال وغیرہ وغیرہ، ان میں کتنے فیصد طلبہ انسانوں کو خدا کی طرف بلانے یا ان تک دین پہنچانے میں مصروف ہیں؟ آج ان کی بھاری اکثریت ریڈیو اسٹیشنوں، اخبارات، چینلوں میں کام کرنے، ترجمہ کرنے، کمپوزنگ کرنے یا پروگرام ترتیب دینے میں مشغول ہے یا کسی عرب سفارت خانہ میں ملازمت یا ملٹی نیشنل کمپنیوں میں خدمات انجام دیتی نظر آتی ہے۔ کیا ملت کے لاکھوں کروڑوں روپے اس لیے صرف کیے گئے تھے کہ چند علما کے معاشی حالات اور معاشی زندگی معیاری ہو جائے؟

قرآن و سیرت کے بجائے فقہ میں زیادہ اشتغال کے نقصانات: صدیوں سے برصغیر کے علماء کرام کا زیادہ تر اشتغال فقہ میں رہا کیوں کہ مسلم دورِ حکومت میں قاضی محتسب اوقاف و وصایا کے متولی و نگراں عہدے، مناصب اور روزی فقہ سے وابستہ تھیں۔ اس کے برخلاف قرآن و سیرتِ نبوی پر توجہ بہت کم رہی۔ برصغیر کے آٹھ سو سالہ مسلم حکمرانی کے دور میں شاید سیرت پر کوئی جامع کتاب نہیں لکھی گئی، نہ نصابِ تعلیم میں سیرت اور قرآن پر کوئی توجہ تھی۔ (الحمد للہ بیسویں صدی میں علماء ہند (جیسے شبلی نعمانیؒ، سید سلیمان ندوی، قاضی سلمان منصور پوری، مولانا مناظر احسن

گیلانی وغیرہ) نے سیرت پراعلیٰ درجے کاعلمی وتحقیقی کام کر کے تلافی کر دی۔اس (فقہ) کی جھلک برصغیر کے نصاب و نظام تعلیم میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔نو دس سالہ نصاب تعلیم میں اصل توجہ فقہ پر ہی رہتی ہے،آخری سالوں میں قرآن اوراحادیث کو اپنے اپنے فقہی مسلک کے سانچے میں ڈھال کر پڑھادیا جاتا ہے،جبکہ اصل کسوٹی قرآن وسنت ہونی چاہیے نہ کہ متأخرین کے فقہی اجتہادات وفتاویٰ۔اس ترتیب وذوق کا بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے یہاں ہر دور میں فقہ القرآن اورفقہ الحدیث کا ملکہ رکھنے والے افراد کمیاب بلکہ نایاب رہے۔

فقہ دور عباسی میں مرتب ہوئی جو ہماری قوت وطاقت اور دنیا بھر پر حکمرانی کا دور ہے۔دور عباسی کے بعد بھی ہم صدیوں تک دنیا بھر میں غالب وحکمران ملت اور سُپر پاورامت کے طور پر تھے،اس لیے ہمارے فقہی ذخیرہ میں قوت وطاقت اور حکمرانی کے دور کے لیے لائحۂ عمل پوری تفصیل کے ساتھ ملے گا،لیکن بے بسی اور کمزوری کے دور کا جب ایک تہائی مسلمان اقلیت میں دوسروں کے رحم کرم پر ہوں اور باقی مسلم حکومتیں بھی دنیا کی باطل ودجالی طاقتوں کے سامنے مجبور محض ہوں،ایسے دور کے لیے لائحۂ عمل اور مکمل رہنمائی جسے ہم فقہ الاقلیات یا بے بسی کے دور کا لائحۂ عمل کہہ سکتے ہیں،ہمارے فقہی ذخیرہ میں بہت کم ملے گا،کیوں کہ جس دور میں فقہ مرتب ہوئی،اس کے بعد صدیوں تک فقہائے کرام اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی دنیا میں ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان کفر کے سامنے ایسے بے بس ولاچار مجبور ومظلوم بن کر زندگی بسر کر رہے ہوں۔اس کمزوری اور ضعف کے دور کے لیے زندگی کے ہر شعبہ کا مکمل اور تفصیلی لائحۂ عمل قرآن اور سیرت میں ملے گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریباً پوری زندگی اور نزول قرآن کا سارا دور مسلمانوں کی بے بسی اور کمزوری کا دور تھا۔صلح حدیبیہ کی شرائط پر ایک نظر ڈالنے سے آٹھ ہجری تک کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔اس صلح نامہ میں ہمارے عصر حاضر کے مسائل ومشکلات میں بہت کچھ رہنمائی اور بصیرت ہے۔ اگر چہ فتح مکہ پورے جزیرۃ العرب کی فتح کے ہم معنی تھی،مگر اطراف کی قوتوں،بزنطین امپائر اور رومن امپائر کے عزائم کو سامنے رکھا جائے اور غزوہ تبوک اور جیش اسامہ کا پس منظر سامنے ہو تو سمجھا جا سکتا ہے کہ بالکل آخری دور تک دشمنان اسلام کی طاقت وقوت کا دور ہے۔ مسلمانوں کو حقیقی اور صحیح معنی میں قوت دور فاروقی میں حاصل ہوئی۔اس لیے پورا قرآن اور پوری سیرت گویا ہمارے آج کے دور کے لیے تفصیلی اور مکمل رہنمائی اور ہر ہر شعبۂ زندگی کے لیے لائحۂ عمل ہے،مگر ہم ہیں کہ فقہ میں اشتغال کے ذریعہ اپنے غلبہ وقوت دنیا بھر پر حکمرانی کا دور سامنے رکھے ہوئے ہیں،اس لیے عصری مسائل میں اپنے لیے نہ کوئی راہِ عمل متعین کر پا رہے ہیں نہ اپنے مسائل کا حل نکال پا رہے ہیں۔

آج کے دور میں ہمیں فقہ کے متعدد ابواب جیسے کتاب الرقاق،کتاب الغنیمۃ بے جوڑ اور ناممکن نظر آتے ہیں۔ بندہ کے نزدیک اپنے غلبہ کے دور میں مرتب ہونے والی فقہ پر ساری توجہ دینے کی وجہ سے نہ ہم آج کا دور سمجھ پا رہے ہیں نہ موجودہ حالات میں اسلام کے غلبہ کی راہیں تلاش کر پا رہے ہیں۔لگتا ہے گویا ہم پر سارے دروازے بند ہیں، مجبوری اور معذوری میں زندگی بسر کرنا ہی ہمارا مقدر ہے۔یہ ساری مصیبت فقہ القرآن اور فقہ السیر ت سے ناواقفیت اور غفلت کی وجہ سے ہے،ورنہ سیرت پاک اور قرآن حکیم آج کے دور کی رہنمائی سے بھرا پڑا ہے۔

<u>برصغیر کے دینی مدارس کا اصل امتیاز:</u> برصغیر میں دیوبند جیسے دینی مدارس کی اصل کامیابی وطاقت جس کا

لوگوں کے دلوں پر سکہ جما ہوا ہے، وہ تصنیف وتالیف، ریسرچ وتحقیق اور دوسرے علمی کارناموں کا نہیں ہے، ان میں دوسرے ادارے مثلاً جامعہ ازہر بہت آگے ہے جہاں ہر طالب علم کو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنا لازم ہے، بلکہ اعظم گڑھ کا معمولی سا چند کمروں پر مشتمل ادارہ دارالمصنفین بھی شاید تصنیفی وتحقیقی کام میں آگے ہے۔ ہمارے دینی مدارس کا اصل امتیاز وخصوصیت تقویٰ وتوکل، تعلق مع اللہ، اتباع سنت، زہد وقناعت والی زندگی، ملت کا درد وغم، دین کی خاطر مر مٹنے اور جاں فروشی کے جذبات ہیں۔ اگر یہ صفات نہ رہے تو دیوبند جیسے مدارس کے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ موجودہ دور کا سب سے تشویشناک پہلو یہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد کئی پشتوں (تقریباً ڈیڑھ سوسالہ) دینی، تعلیمی واصلاحی جدوجہد کے برگ وبار آنے کا وقت آیا تو تقویٰ وتوکل کی جگہ عالی شان عمارتوں اور مال کی ریس نے دینی اداروں کو کھوکھلا اور بے روح بنا دیا۔ خاص طور سے گذشتہ تیس چالیس سال سے ساری توجہ ظاہری شان وشوکت والی عمارتوں نے کھینچ لی، علم اور مجاہدے کا دور ختم ہو گیا، ایمانی صفات میں ضعف آ گیا اور افراد سازی سے توجہ ہٹ گئی۔ ہماری صفوں میں بہت سی کالی بھیڑیں داخل ہو گئیں، دینی مدارس کی عمارات جتنی بلند وبالا اور خوبصورت بنتی گئیں، ظاہری سجاوٹ کے ساتھ دلوں کی باطنی دنیا اجڑتی گئی۔ تعلق مع اللہ، تقویٰ وتوکل، زہد وقناعت، سادگی اور جفا کشی کم ہوتی گئی۔ بلاشبہ بہت سے دینی مدارس میں کسی درجہ میں یہ صفات باقی ہیں اور کسی نہ کسی درجہ میں افراد کار بھی وہاں ہی تیار ہو رہے ہیں، اکیسویں صدی داخل ہونے تک ہمارے تعلیمی ادارے ظاہراً تو بہت بارونق اور عالی شان ہو گئے، مگر علمی وروحانی اخلاقی عملی طور پر بھیانک تباہی آ گئی۔ آخرت کی طلب، دنیا سے بے رغبتی، دین پر مر مٹنے کا جذبہ، عوام تک دین پہنچانے کی تڑپ وکڑھن اور نبیوں کی طرح بے طلب لوگوں میں دین پہنچانے کے لیے مارے مارے پھرنا ماضی کی داستان بن گیا۔ اب دینی ادارے دکان اور فیکٹریوں کی طرح چلائے جانے لگے۔ یہ مدارس ذاتی، خاندانی اور موروثی جائیداد بن گئے جس کی وجہ سے موروثیت کی تمام خرابیاں اور فساد در آیا۔

آج کل دین کے نام پر ہم مولویوں کی ساری جدوجہد کا لب لباب یہ ہے کہ ہمیں پیسے دو، ہم اپنا ایک الگ ادارہ قائم کریں گے۔ ہم میں ہر شخص کے پاس کروڑوں اربوں کے منصوبے اقوام عالم تک ایمان واسلام پہنچانے یا ملت اسلامیہ کی تربیت وافراد سازی کے نہیں، محض عالی شان عمارات بنانے کے ہیں۔ دین کے نام پر ہر وقت مانگنے والا پیشہ ور طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ بقول مولانا زاہد الرشدی کے آج ہمارے بہت سے مولوی صاحبان کا تعارف وشناخت یہ ہے: ہر وقت مانگنا، ہر ایک سے مانگنا اور ہر چیز مانگنا۔ کسی معاشرہ میں مانگنے والے کا جو مقام وحیثیت ہوتی ہے، وہی ہماری بنتی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی ہم نے سنجیدگی سے اس مسئلہ کو نہ لیا تو عالم بننا اعزاز کے بجائے ذلت کا لیبل بن جائے گا اور شاید سمرقند وبخارا کی تاریخ یہاں بھی دہرادی جائے۔

دینی مدارس کی موجودہ صورت حال کا ایک جائزہ: اگرچہ ہر مدرسہ کے ذمہ دار زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ہمارے ادارے سے فارغ ہونے والے دنیا میں دین پھیلائیں گے، سوال یہ ہے کیسے پھیلائیں گے جبکہ آپ نے نہ دعوت کی تربیت، دی نہ داعی کا مزاج بنایا، نہ آخرت کی فکر پیدا کی، نہ روحانی وباطنی اوصاف سے آراستہ کیا بلکہ وہ بھی اوروں کے دیکھا دیکھی دین کے نام پر اپنی ذاتی جائیدادیں بنائیں گے۔ آج صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ ہر مولوی

جو چرب زبانی سے اہل مال کی جیب سے مال نکلوانے کا فن جانتا ہے، وہ رئیس الجامعہ یا حضرت مہتمم صاحب سے کم پر راضی نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ مہتمم بنتے ہی میری اولاد، دامادوں اور دیگر رشتہ داروں کی روزی کا مسئلہ مستقل حل ہوجائے گا۔ حضرت مہتمم صاحب سے کون پوچھ سکتا ہے کہ آپ نے خود کی اور اولاد کی تنخواہ کس معیار پر مقرر کی، اس لیے وہ کسی قدیم بنے بنائے ادارے میں خدمات انجام دینے کے بجائے اپنا جامعہ ضروری سمجھتا ہے۔ اگر مہتمم کا کوئی علمی، اخلاقی وروحانی معیار مقرر کرکے امتحان لیا جائے تو شاید نوے فیصد مہتمم صاحبان فیل ہوجائیں گے۔ بندہ نے یہاں انگلینڈ میں اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا کہ اپنا جامعہ قائم کرنے کی خاطر مولوی صاحبان ہر قسم کی عصبیت جاہلیت، علاقائی، ضلعی، گروہی، لسانی، برادری وقومی حتیٰ کہ ایک ہی ضلع کے لوگوں میں شہر سے آنے والے اور دیہات سے آنے والے اور براہ راست انڈیا سے آنے والے اور افریقی ملکوں میں جاکر آنے والوں میں عصبیت بھڑکائی تاکہ میرے ضلع، گاؤں برادری کا پیسہ باہر نہ جائے۔ کیا ایسے دارالعلوموں سے للٰہیت اور مجاہدے کے ساتھ دین کا کام کرنے والا طبقہ پیدا ہوگا؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے خود احتسابی کا عمل بالکل ترک کردیا ہے۔ ہم میں کوئی کسی منکر پر نکیر کرنے کے لیے تیار نہیں کہ میری مقبولیت اور تعلقات میں فرق نہ پڑے، مجھے سبھی اچھا سمجھتے رہیں۔ ہمارے بعض بزرگ جو اہل مدارس کے نزدیک نہایت محترم سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی نجی مجالس میں ان خرابیوں کا تذکرہ کرلیتے ہیں مگر براہ راست ان ذمہ داروں کو ٹوکنے کے لیے تیار نہیں۔ جامعہ کے معنی یونیورسٹی کے ہیں جو ضلع میں ایک آدھ ہی ہوتی ہے، مگر یہاں دومیل کے فاصلے پر اور ایک ہی بستی میں متعدد جامعات بن رہے ہیں۔ جامعہ کہاں کس جگہ کس سائز کا بنے، آج یہ سب ایک فرد کی مرضی پر موقوف ہے جسے حضرت مہتمم صاحب بننا ہے۔

ابھی اکتوبر۲۰۱۱ء کے اخیر میں استنبول (ترکی) میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ پر منعقد ہونے والی انٹرنیشنل کانفرنس میں بندہ سے ایک رئیس الجامعہ صاحب فرمانے لگے، مولانا! آپ ہم سے بہت خفا لگتے ہیں اور سخت الفاظ میں ٹوکتے اور لکھتے ہیں، مثبت کام کیجیے۔ بندہ نے عرض کیا، آپ تمام حضرات تو ماشاء اللہ مثبت کام کرہی رہے ہیں۔ لاکھوں مولوی مثبت کام میں لگے ہوئے ہیں، کیا اتنا سارا مثبت کام کافی نہیں ہے؟ آج ہم نے مداہنت کو مثبت کام سمجھ لیا ہے۔ یہ دکانوں کے انداز پر قائم ہونے والے شخصی جامعات نااہل مولویوں کا ڈھیر لگاتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے علم اور علما دونوں کا وقار اور عظمت مٹی میں مل رہا ہے۔ جیسے کسی شہر میں پچاس ڈاکٹروں کی ضرورت ہو، آپ وہاں پانچ سو ڈاکٹر پیدا کردیں تو ڈاکٹروں کی نہ صرف قدروقیمت ختم ہوجائے گی بلکہ ڈاکٹر صاحبان ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ کر اپنے پورے طبقہ کی ذلت کا سبب بنیں گے۔ یہی ہم مولویوں کی صورتحال ہے۔ یاد رکھیے! تعلیم وتعلم یا دین سکھانے کے دو مرتبے ہیں۔ ایک فرض عین، دوسرا فرض کفایہ۔ فرض عین ہے ہر مسلمان کو اس کی ضروریات کا علم دینا اور فرض کفایہ ہے کچھ افراد کو پورے دین کا تفصیلی علم دلائل کے ساتھ دینا۔ آج ہماری ساری توجہ فرض عین کے بجائے فرض کفایہ پر ہے، کیوں کہ فرض عین میں نبیوں کی طرح جان کھپانی پڑتی ہے اور لوگوں میں مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس فرض کفایہ میں لگنے سے ہم حضرت مہتمم صاحب اور حضرت رئیس الجامعہ بن کر اپنے حلقوں اور بستیوں کی اہم شخصیت بن سکتے ہیں جسے بندہ اسلامی وڈیرے وجاگیردار کہتا ہے۔

دعوت کی مثال بادل کی سی ہے کہ بادل ہر جگہ خود جا کر بے طلب لوگوں پر برس کر بنجر زمینوں کو سیراب وشاداب بنادیتا ہے اور دینی اداروں کی مثال کنویں کی سی ہے جسے طلب وضرورت ہو، ہمارے پاس آئے۔ حضرات انبیا علیہم السلام بادل بن کر رہتے تھے، نہ کہ کنواں بن کر۔ حضرت مولانا سعید احمد خان مکی فرمایا کرتے تھے: کُـن عـالماً و لا تـکـن مـولویاً۔ اگر بھارت کے پندرہ کروڑ مسلمانوں کو آپ مولوی قاری حافظ مفتی بنادیں تو کیا آپ کے سارے مسائل حل ہوجائیں گے؟ کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا، سارے تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی وفکری مسائل اپنی جگہ پر رہیں گے۔ بلاشبہ دین کے لیے دارالعلوم اور جامعات ضروری ہیں، مگر یہ ضروری نہیں کہ سارے مولوی صاحبان ملت کے تمام اجتماعی مسائل سے آنکھیں بند کرکے ایک ہی کام کرتے رہیں۔

<u>علماء کرام کی عوام سے لاتعلقی خطرے کی گھنٹی</u>: آج سب سے تشویشناک اور فکرانگیز مسئلہ یہ ہے کہ اگرچہ دینی اداروں کی بہتات ہے، مگر علما اور عوام کا جوڑ وتعلق ختم ہوتا جارہا ہے۔ آج برصغیر کے تینوں ملکوں میں جو دینی پروگرام ہوتے ہیں، ان میں زیادہ تر علماء کرام اور طلباء مدارس ہوتے ہیں۔ عام مسلمانوں میں سے بہت کم لوگ نظر آتے ہیں۔ ہمارے کاشتکار، ہمارے تاجر، ہمارا ملازمت پیشہ طبقہ، ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ اور ملت اسلامیہ کے دیگر طبقات کے لوگوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ کیا دین واسلام ان کا مسئلہ نہیں ہے یا انھیں دینی رہنمائی کی ضرورت نہیں؟ یہ صورتحال خطرے کی گھنٹی ہے، باطل طاقتیں ایسے ہی مواقع سے فائدہ اٹھاکر مسلم عوام کو ورغلاکر علما کے خلاف استعمال کرتی رہی ہیں۔ اگر علماء کرام کا اپنے عوام سے مضبوط تعلق قائم رہے تو باطل کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ماضی میں سمرقند، تاشقند اور بخارا کی تباہی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ علماء کرام اپنے عوام سے بے تعلق اور بے نیاز ہوگئے تھے، اس سے فائدہ اٹھاکر کمیونسٹوں نے مسلم عوام کو بھڑکاکر انہیں کے ہاتھوں علماء کرام، مدارس ودینی شعار کا خاتمہ کروایا۔ آج بھی باطل طاقتوں کی پوری کوشش ہے کہ مسلم عوام کو علماء کرام سے دور کیا جائے۔

ہمارے اکابرین اپنے گاؤں ضلع علاقہ میں عوام سے گہرا تعلق رکھتے تھے، جیسے مظاہر علوم وقف کے حضرت مفتی مظفر حسینؒ صبح دو تین گھنٹے حدیث کا درس دیتے اور ظہر کے بعد اکثر اطراف کے کسی گاؤں یا دیہات میں جاکر لوگوں سے ملتے، دین کی باتیں بتاتے، موسم خواہ کتنا ہی سخت ہو، سخت گرمی ہو یا سردی یا بارش ہو۔ آخری عمر میں لوگ عرض کرتے کہ حضرت! آپ کی صحت کا تقاضا ہے کہ آرام کیجیے، ان گاؤں والوں کو یہیں بلوالیتے ہیں تو فرماتے، وہاں سے دو چار آدمی آئیں گے، لیکن جب میں وہاں جاؤں گا تو پورا گاؤں مجھ سے ملے گا، دین کی باتیں مجھ سے سنے گا۔ اسی طرح حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ اور دیگر اکابرین عام مسلمانوں سے وابستہ رہتے تھے، جبکہ آج ہم عوام سے کٹتے جارہے ہیں۔ اس مسئلہ پر ہمیں سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔